پروفیسر اختر حسین عاصم☆

مذہبی انتہا پسندی اور اس کا تدارک

[ڈاکٹر ہمایوں عباس (شعبہ اسلامیات جی سی یونیورسٹی) کی کتاب ''مذہبی انتہا پسندی اور اس کا تدارک تعلیمات نبویؐ کی روشنی میں'' کی تقریب رونمائی منعقدہ ۶ مئی ۲۰۰۶ء بمقام ہمدرد سنٹر لاہور میں پڑھا گیا۔]

جناب صدر اور حاضرین محترم!

صاحب کتاب جناب ڈاکٹر ہمایوں عباس شمس نے اپنی کتاب ''مذہبی انتہا پسندی اور اس کا تدارک تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں'' میں اس دور کا ایک انتہائی حساس موضوع چھیڑا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس موضوع پر خوب غور وفکر کیا جائے اور امت کا صاحب دانش اور صاحب علم طبقہ بالخصوص اجتماعی طور پر اس عمل میں شریک ہو۔ اس موضوع کے مختلف پہلو سامنے لائے جائیں اور ایک ٹھوس لائحہ عمل تجویز کیا جائے۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ ہمارے نوجوان اسکالر نے اس سلسلے میں قلم اٹھایا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی یہ تحریر اس عمل کے لیے مہمیز کا کام دے جائے۔

مصنف نے اپنی اس کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں انہوں نے مذہبی انتہا پسندی کے مفہوم اور محرکات پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ باب اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس میں مذہبی انتہا پسندی کا مفہوم متعین کیا گیا ہے، کیونکہ جب تک بنیادی مسئلے کا تعین نہ ہو، بات آگے نہیں بڑھ سکتی۔

انتہا پسندی دراصل ایک طرز عمل کا نام ہے۔ اگر کوئی شخص پرامن بقائے باہمی پر یقین رکھتا ہے، دوسرے لوگوں کو اپنے اپنے دائرے میں اپنی رائے پر عمل کرنے دیتا ہے، باہمی تعلقات اور باہمی مکالمہ پر یقین رکھتا ہے، افہام وتفہیم سے کام لیتا ہے تو اس کا یہ طرز عمل اس بات کی شہادت ہے کہ وہ انتہا پسند نہیں۔ لیکن اگر وہ کسی دوسری رائے کو برداشت کرنے پر بھی تیار نہیں، اگر وہ مخالفین کو زندہ رہنے کا حق دینے پر آمادہ نہیں، اگر وہ باہمی مکالمہ اور باہمی رواداری پر یقین نہیں رکھتا تو بلاشبہ اس کا یہ رویہ انتہا پسندانہ کہلائے گا۔

میری رائے میں اصل مسئلہ کسی عقیدے یا نظریے کا حامل ہونا نہیں، بلکہ ایک تربیت کا ہے۔ ہم نے اپنے معاشرے میں افراد کی اس سطح پر تربیت کی ہی نہیں۔ ہمیں یہ درس نہیں دیا جاتا کہ ہم دوسروں کے ساتھ رائے کے اختلاف کے باوجود

☆ شعبہ اسلامیات جی سی یونیورسٹی لاہور

معاشرتی سطح پر خوشگوار تعلقات رکھ سکتے ہیں۔ ان سے انسانی سطح پر اور پھر وسیع تر اسلامی اخوت کی سطح پر باہمی احترام کا رشتہ قائم کر سکتے ہیں۔ ہمیں گھروں میں بڑوں کی طرف سے اور منبر ومحراب سے علمائے کرام کی طرف سے جب پکڑ لو، پکڑ لو اور مار دو مار دو کا سبق ملے گا تو اس کے منفی اثرات تو لامحالہ ہمیں بھگتنے پڑیں گے۔ افہام وتفہیم کا راستہ کھلا رکھا جائے، دوسروں کی بات کو اگر وہ دلائل کے ساتھ ہے، سننے کا حوصلہ پیدا کیا جائے اور ایک دوسرے کو برداشت کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ معاشرہ انتہا پسندی سے پاک نہ ہو جائے۔

اس مسئلے کے تدارک کے حوالے سے جو یہ حکمت عملی اپنائی جاتی ہے کہ ہر قسم کی اختلافی تحریروں پر پابندی لگا دی جائے، اس میں کچھ حدوں کی نشان دہی ضروری ہے۔ اگر تو کوئی تحریر محض دشنام طرازی پر مشتمل ہے اور اس میں مار دو پکڑ لو کا درس ہے، اس کی زبان اخلاق سے گری ہوئی ہے تو ایسی کتابوں کی اشاعت کا کوئی جواز نہیں اور ایسی کتابوں کی اشاعت پر سختی سے پابندی ہونی چاہیے۔ اس باب میں دو آرا ممکن ہی نہیں۔ لیکن شائستگی، علمی وقار اور دیانت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھی جانے والی اختلافی تحریروں اور بحث مباحثے کی راہ کھلی رکھنی چاہیے، ورنہ معاشرے میں ایسی گھٹن پیدا ہوگی کہ پورا معاشرہ یا تو ایک مردہ معاشرے بن جائے گا اور یا پھر پریشر ککر کی طرح اس میں پریشر جمع ہوتا جائے گا اور پھر ایک دن ایک دم پھٹے گا اور پورے معاشرے کو انارکی (Anarchy) کا شکار کر دے گا۔

صاحب صدر!

مذہبی انتہا پسندی کی دو سطحیں ہیں۔ ایک، کسی بھی دین کے اندر موجود مختلف مسالک اور مذاہب کے درمیان نفرت اور دشمنی اور دوسرے، مختلف ادیان کے ماننے والوں کے درمیان نفرت اور دشمنی۔ ان میں سے ہر ایک سطح پر مسئلہ کی نوعیت کچھ مختلف ہو جاتی ہے لیکن ایک پہلو جو بڑا عجیب ہے، میں اس کی نشان دہی کرنا چاہتا ہوں۔ نرالا قصہ یہ ہے کہ عقلی طور پر تو مختلف ادیان کے ماننے والوں کے درمیان مناقشت، نفرت یا دوری زیادہ ہونی چاہیے اور ایک کلمے اور ایک دین کے ماننے والوں کے درمیان نفرت یا دوری کا اصلاً تو جواز ہی نہیں، لیکن اگر ہو تو اس میں شدت نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن یہ عجیب قصہ ہے کہ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں مسلمانوں نے آپس کے تنازعات میں تو شدت پسندی سے کام لیا ہے، لیکن دوسرے ادیان ومذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ ان کا رویہ عام طور پر رواداری اور برداشت کا ہی رہا ہے۔

معاشرے میں انتہا پسندی کی بڑی وجوہات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس میں جہالت ایک بڑے عنصر کے طور پر سامنے آتی ہے۔ دین سے بے خبری، خود قرآن وحدیث سے بے خبری۔ قرآن کی تلاوت مفہوم سمجھے بغیر کی جاتی ہے۔ اس عمل کے ثواب اور اس کی برکات سے انکار نہیں، لیکن قرآن کتاب ہدایت ہے۔ ہدایت پر عمل کرنے کے لیے پہلے اسے سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم قرآن مجید کا مطالعہ مطالب اور مفاہیم کو سمجھ کر کریں تو اس سے کئی معاملات سلجھ سکتے ہیں اور انتہا پسندی میں کمی آسکتی ہے۔ ہمارے ہاں ہر کس وناکس حساس سے حساس مسئلے پر بڑی قطعیت سے رائے دینے کا عادی ہے، حالانکہ اکثر ان کے پاس قرآن اور حدیث کا علم سرے سے ہوتا ہی نہیں۔ اس قطعیت میں ایک بے جا ضد شامل ہو جاتی ہے۔

دوسرا عنصر برداشت اور رواداری کی عدم موجودگی ہے۔ ہمارا معاشرہ مجموعی طور پر برداشت سے محروم ہوتا جا رہا ہے،

عجلت پسندی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ معمولی معمولی باتوں پر طیش میں آجانا، ہتھیار اٹھا لینا، مرنے مارنے پر تیار ہوجانا ہمارا معمول بن چکا ہے۔ اس رویے کی تہذیب اور اصلاح کی سخت ضرورت ہے۔ انسان کو مخالفانہ رائے کو حوصلے سے سننے کی تربیت کرنی چاہیے اور اس کے ساتھ اختلافی بات کو بڑے مہذب طریقے اور سلیقے سے کرنے کا فن بھی سیکھنا چاہیے۔

مصنف نے بجا طور پر نشان دہی کی ہے کہ ایک دوسرے پر کفر اور شرک کے فتوے لگانے سے انتہا پسندی کو فروغ مل رہا ہے۔ یہ بات اصولی طور پر طے ہوجانی چاہیے کہ تمام کلمہ گو جو رسول عربی ﷺ کو اللہ کا آخری رسول اور پیغمبر مانتے ہیں، مسلمان ہیں اور ان کے درمیان فقہی اختلافات کے باوجود کسی کو کسی پر کفر اور شرک کا فتویٰ نہیں لگانا چاہیے۔ جہاں تک فقہی اختلافات کا تعلق ہے، اس ضمن میں توسع سے کام لینا چاہیے۔

اس کتاب کے دوسرے باب میں انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے نبوی تعلیمات سے جو رہنمائی ملتی ہے، اسے واضح کیا گیا ہے۔ اس باب میں مصنف نے ایسی بہت سی مثالیں نقل کی ہیں جن سے امت کے سلف صالحین اور بزرگوں کا اس معاملے میں طرز عمل سامنے آتا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت ابن عمرؓ خارجیوں کے پیچھے نماز پڑھ لیتے تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ کا یہ قول سامنے آتا ہے کہ جو شخص جمعہ کی نماز کسی کے پیچھے پڑھنے کے بعد دوبارہ پڑھے گا، وہ بدعتی ہے۔ ابن حزمؒ نے فاسق کے پیچھے نماز پڑھنے کے بارے میں صحابہؓ کا موقف اور عمل واضح کیا ہے اور مثالیں دی ہیں کہ وہ فاسق کے پیچھے بھی نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ فتاویٰ عام ہیں کہ فلاں کے پیچھے نماز نہیں ہوتی اور اکثر ایسی صورتوں میں ہمارے علمائے کرام نماز کو لوٹانے یا دوبارہ پڑھنے کا حکم دیتے ہیں۔

مصنف نے تعلیمات نبوی ﷺ کی روشنی میں انسانی جان کی حرمت واضح کی ہے۔ اس حرمت کی خلاف ورزی کی صورت میں جو سخت وعیدیں آئی ہیں، ان کو بیان کیا ہے۔ ایک شخص رسول اللہ ﷺ پر ایمان بھی رکھتا ہو لیکن انسانی جان اور مومن کی جان کے بارے میں آپ کی اتنی صریح تعلیمات کو پس وپشت ڈالتا ہو، اسے اپنے ایمان کے متعلق از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

یہی نہیں، اسلام تو کسی بھی دین کے ماننے والوں کی عبادت گاہوں کو چھیڑنے یا ان سے تعرض کرنے سے بھی سختی سے منع کرتا ہے۔ انسانی جان کے تحفظ کے ساتھ ساتھ عزت نفس کے تحفظ پر خصوصی زور دیتا ہے۔ ایک دوسرے پر عیب لگانا، طعنے دینا، اشاروں کنایوں یا واضح لفظوں میں کسی کی اہانت کرنا، کسی کو کم قدر یا حقیر جاننا، ان سب سے سختی سے منع کرتا ہے۔ ایسا دین، قتل وغارت گری کی کیوں کر اجازت دے سکتا ہے۔

تیسرے باب میں فاضل مصنف نے اتحاد کی تلقین کی ہے۔ اس باب میں انہوں نے انتشار کے مفہوم اور اس کے محرکات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ قرآن کے اندر نہ صرف اتحاد کی تلقین موجود ہے بلکہ اس کی بنیاد بھی واضح کی گئی ہے۔ حبل اللہ سے تمسک اور فرقہ واریت کی سخت ممانعت 'ولا تفرقوا' کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ انتشار کسی بھی صورت میں پسندیدہ نہیں قرار دیا گیا۔ ہمیں کتاب میں ایک دلچسپ بحث ۷۳ فرقوں والی مشہور حدیث کے مفہوم سے متعلق ملتی ہے۔ مختلف علمائے امت کے موقف کی روشنی میں اس روایت کے صحیح مفہوم کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مصنف نے مختلف ادیان کے ماننے والوں میں انتہا پسندی کے موضوع پر بھی آخر میں تین صفحات میں روشنی ڈالی ہے، لیکن لگتا ہے کہ یہ پہلو مصنف کی بحث کے دائرے سے خارج تھا اور اس میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کتاب کی کسی اگلی اشاعت میں اس باب میں مفصل بحث آنی چاہیے۔

مجموعی طور پر مصنف کی یہ کوشش قابل قدر ہے۔ کتاب کے مختلف مباحث پر نظر ڈالنے سے یہ خوشگوار حقیقت سامنے آتی ہے کہ انہوں نے جن علمائے کرام کی آرا نقل کی ہیں، وہ مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے مصنف کا توسع سامنے آتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس روایت کو آگے بڑھایا جائے۔

ہم منتظر رہیں گے کہ مصنف اس سلسلے کو آگے بڑھائیں اور رواداری اور توسع کے جذبے کو پروان چڑھانے میں اپنا کردار ادا کریں۔ اگر امت کے علما اس طرز عمل کو اپنا لیں تو ہمارا معاشرہ ایک حقیقی اسلامی معاشرہ بن سکتا ہے۔

> ''اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ کسی قول کی تشریح وہی معتبر ہوگی جس کا اظہار اس کے قائل کی طرف سے ہو تو آج تمام مذہبی تفرقے آن کی آن میں ختم ہو سکتے ہیں۔ سنی مسلمان شیعوں سے دریافت کریں کہ فلاں فلاں مسئلہ میں تمہارا عقیدہ کیا ہے۔ ..... سنیوں کا فرض ہے کہ ان کی اس تشریح کو تسلیم کریں۔ اسی طرح شیعہ حضرات کو اہل سنت سے ان کے عقائد دریافت کرنے چاہییں اور ان کی تشریح کو تسلیم کرنا چاہیے۔ فساد کی جڑ یہ ہے کہ ایک فرقہ خود ہی دوسرے فرقہ کی طرف باتیں منسوب کرتا اور پھر ان پر جھگڑا شروع کر دیتا ہے۔ ''وہابی'' کہتا ہے کہ یہ میرا عقیدہ اور مسلک نہیں، مگر مخالف کہتا ہے تو ہزار انکار کرے، مگر تیرا یہی عقیدہ ہے جو میں تیری طرف منسوب کر رہا ہوں۔''
>
> بڑا ہی خوش آیند اور مبارک دن وہ ہوگا جب یہ زریں اصول کلمہ گو فرقوں کے آپس میں طے پا جائے اور امت کو ''تکفیر'' کی لعنت سے نجات مل جائے۔ اچھے اچھے ثقہ، محتاط، متدین بزرگوں کو دیکھا ہے کہ دوسرے فرقہ کی جانب بے تکلف وہ خیالات اور عقیدے منسوب کرتے چلے جاتے ہیں جن سے وہ فرقہ کانوں پر ہاتھ دھر دھر کر برابر انکار کیے جا رہا ہے۔ یہ بلا کچھ آج سے نہیں، کہنا چاہیے کہ تابعین ہی کے دور سے امت پر مسلط ہو گئی ہے اور کیسے کیسے اکابر دوسرے اکابر کے ہاتھ سے انتہائی بدنامی کے ہار گلے میں ڈالے نظر آ رہے ہیں۔''
>
> (صدق جدید، ۱۸/اگست ۱۹۶۱)